

اسلامی نصاب تعلیم

کے

بنیادی نقاط

ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب
پروفیسر عربی، جامعہ کراچی

مکرمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ آپ کے سوالنامہ کا ہر سوال ایک مستقل عنوان ہے ایک موضوع جو سب سے زیادہ اہم ہے اس پر اپنے خیالات قلمبند کر دئے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کی فزائش کی تکمیل ہو جائے گی۔

مخلص۔ محمد یوسف

آغاز اسلام سے لے کر بارہویں صدی ہجری تک کتنے سیاسی انقلاب آئے، عالم اسلام کتنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا، خانہ جنگی بھی ہوئی، لیکن نصاب تعلیم کی بابت جو تصور عام تھا وہ بدستور کونے کونے میں یکساں طور پر واضح اور نمایاں رہا۔ مقررے عرصہ کے لئے فاطمیین نے مصر میں اپنے مخصوص عقائد کی تعلیم کا جو طریقہ رائج کیا وہ ایک اہم تبدیلی ضرور تھی۔ لیکن "لادینی" نہ تھی نظام الملک کے عہد سے مشرق میں معقولات کو جو غلبہ حاصل ہوا اُسے محض "تطویر" کہنا چاہئے جو اُس دور میں اس بات کی علامت تھی کہ اسلامی نصاب تعلیم کی آغوش عصری علوم معقولہ و ذلیلہ کے لئے کشادہ ہے۔ اگر کے دور میں بے شک اسلامی نصاب تعلیم کی بیخ کنی کی بھرپور کوشش ہوئی جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور ناکام رہی۔ ملا عبدالقادر بدایونی اس دور کی بابت لکھتے ہیں: عربی خواندن و دانستن آن عیب شد و تنقہ و تفسیر و حدیث و خوانندہ آن مطعون و مردود۔ حکم شد کہ ہر قوم ترک علوم عربیہ نمودہ غیر از علوم غریبہ از نجوم و حساب و طب و فلسفہ خوانند۔ آخر میں ملا صاحب ان

دو ایامت پر فخر کرتے ہیں :

مدرس از علما آن چنان بود خدائی کہ ماہ روزہ ز سہ خانہ ختمار
برند توفیق روح ادیب از پند کنند مصحف قادی گر و بوجہ قمار

اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی نقاط کی نشاندہی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی تاریخی دستاویز نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان و ادب، تفسیر، حدیث و فقہ اسلامی نظام تعلیم کی روح ہے۔ اکر کا مقصد ناپاک ہے اسکی سمجھ بالکل درست تھی۔ اس نے اسلامی نظام تعلیم کی روح سلب کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اکر جو نہ کر سکا وہ میکا سے لے کر تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے برقعہ کے نظام تعلیم میں جو تبدیلی آئی وہ بنیادی تھی۔ اس کی بدست ہماری فکر میں جو روٹی پیدا ہوئی، وہ آج ایک لاعلاج مرض بن گئی ہے۔ اسی کی بدولت ہماری سیاست میں انتشار اور کھوکھلے خردوں کے سوا کچھ باقی نہیں، ملی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

اکبر اور میکا کے دونوں کا عملہ راست تھا۔ وہ اسلامی نظام تعلیم کی روح سلب کرنا چاہتے تھے، ایک ناکام رہا، دوسرا شاذ و نادر کے میاب ہوا۔ پھر بھی دونوں کھلے برہنہ جانے پہچانے دشمن تھے دونوں کی بابت علماء کا جواز داذہ تھا تاریخی حقائق ثابت کر چکی۔ پچھلے گزشتہ صدی کے علماء پر انگریزی زبان اور سائنس کے خلاف تحریک اور دشمنی برپا رہی ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کسی صورت عربی زبان و ادب، تفسیر و حدیث فقہ کو سودا کرنے کی تیار نہ تھے۔ اگر وہ یہ سودا کر لیتے اور اپنی طور پر عظیم المثال افغانوں اور افغانوں کے ساتھ یہ سودا کر لیتے تو اسلامی نظام تعلیم کی روح میں باقی نہ رکھتے تو آج جو حال ہوتا اس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔

مذکورہ بالا پس منظر میں دیکھتے : آج ہمارے یہاں دو متوازی نظام تعلیم رائج ہیں۔ ایک طرف مدارس عربیہ اسلامیہ میں دوسری طرف اسکول کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے جو نئے عوامل بروئے کار آئے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اس دونی، بلکہ کہنا چاہئے۔ نظام کو ختم کر کے موحد قومی اسلامی نظام تعلیم تشکیل دیا جائے۔ مدارس میں عربی، تفسیر و حدیث فقہ اسکول کالج یونیورسٹیوں میں انگریزی، جدید اجتماعی علوم اور سائنس سہ لگائی جائے۔ اس سے اختلاف نہیں کہ ان دو اجزاء کو باہم یکجا کر دیا جائے تو ایسا نظام تعلیم وجود میں آئے گا جو دین و دنیا دونوں میں توازن برقرار رکھے۔ بلندی کا خاتم ہوگا۔ دو اجزاء ہیں کے ایک جزو مدارس میں ہے۔ اور دوسرا میکا کے رائج کردہ تعلیمی اداروں میں۔ انہیں یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ مدارس میں عربی تفسیر حدیث فقہ

کے ساتھ انگریزی، جدید عمرانی علوم اور سائنس کو جگہ دی جائے، دوسری یہ کہ اسکول کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی تغیرِ حدیث فقہ کو پورے نظامِ تعلیم کی روح کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔ مدارس پر علماء کو اقتدار اور خود مختاری حاصل ہے۔ اور بجا طور پر حاصل ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ عموماً وہ بانی دارالعلوم دیوبند کی وصیت کے خلاف امیروں کی شرکت اور سیٹھوں کے بڑے بڑے غلیات پر تکیہ کرنے لگے ہیں۔ پھر بھی حکومت کی مالی امداد سے بے نیاز ہیں۔ فرض کیجئے کہ دانائے دین جوہد کا منکاد ہیں، جدید علوم کی قدر نہیں جانتے تو (یہ کیا ہے کہ ہر کس و ناکس علماء کا ناصح بن کر مدارس کی اصلاح پر تلا ہوا ہے؟ یہ ناصح بیک جنبشِ قلم دوسری صورت کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اسکول کالج اور یونیورسٹیاں تو تمام تر دانش خیالوں کے قبضہ قدرت اور تصرف میں ہیں۔ وہ تو زمانے کے تقاضوں کو، بلکہ یوں کہتے کہ ہول کے رخ کو پہچاننے میں ہمارت رکھتے ہیں۔ وہ میکاے کے نظام کی اصلاح کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ [کاش وہ کچھ نہ کرتے۔ لیکن انہیں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ وہ کر رہے ہیں۔ اور جو میکاے سے نہ ہو سکا۔ وہ کر رہے ہیں۔ علماء جو نہیں کرتے وہ تو سب کو معلوم ہے۔ اور یہ جو کرتے ہیں اس کی حقیقت کا کسی کو اندازہ نہیں، "سادگی مسلم کی دیکھ" علماء نے بھی یہ غور کرنے کی زحمت نہ کی کہ جو ہو رہا ہے اس کے مضرات کیا ہیں

اکبر اور میکاے نے راست حملہ کر کے اسلامی نظامِ تعلیم کی روح سلب کی، اب سیاسی مصلحت راست حملہ کی اجازت نہیں دیتی اس لئے میکاے کی طریقت کے سالک اسلام کی روح سلب کرنے

لے مولانا محمد قاسم کی تحریر کردہ ایک اصل: "سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ ضرر دہم ہوتی ہے۔" مولانا کی تاکید اُچی کہ دارالعلوم کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہوتا کہ یہ تعلق خود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے۔۔۔۔۔ انیسویں آج یہ تعلق صرف قربانی کی کھالوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ مولانا فضل الرحمن نے اسی کو یوں نظم کیا تھا:

اسکے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا پھر یہ تبدیلِ معلق اور تزلزل کا چیراغ یہ سمجھ لینا کہ بے نیر و ضیا ہو جائے گا اس کے مقابلہ میں سرسید کا علی گڑھ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت پر قائم ہوا لیکن دماغ سے جو عام مسلمانوں سے تعلق رکھنے کی غرض سے ہر سال اساتذہ و طلبہ کے دفود ملک کے طول و عرض میں بھیجے جاتے تھے عرصہ تک علی گڑھ ایک عوامی قومی تحریک کا نام تھا۔ آج علی گڑھ بھی حصن ایک یونیورسٹی ہے۔

کی بجائے اسلام کی روح مسخ کر رہے ہیں۔ (ایوب کے دود کا سب سے گھناؤنا عمل یہ تھا کہ نام نہاد ماہرین تعلیم میں سے ایک دو کو اسلام، اسلامی تعلیم اور سب سے بڑھ کر اسلامی تحقیق اور ریسرچ کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔ ان ٹھیکہ داروں نے عربی اسلامی علوم کے جہل تام کے باوجود جس ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا وہ صرف ایک صنیر فروش ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے ایک نئی اسلامیات ایجاد کی جس میں ہو بہو اکبر کی تقلید کرتے ہوئے ”عربی خواندن و دانستن آل عیب شد“ جسے یقین نہ آئے وہ ہماری یونیورسٹیوں کے اسلامیات کے نصاب کو ذرا غور سے پڑھ لے۔ اس اسلامیات میں قرآن و حدیث کی بجائے چند آیات و احادیث کا اردو ترجمہ پڑھایا جانے لگا۔ اور رائج الوقت نظریات میں سے کسی کے ساتھ ”اسلامی“ اور کسی کے ساتھ ”غیر اسلامی“ کا سابقہ لگا کر انگریزی اور اردو میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظریہ حیات کا سراسر غیر علمی غیر مستند من مانا چوں چوں کا مرتبی تیار کیا گیا۔ اس نظریہ حیات نے علم فقہ و شریعت کے مطالعہ کی صبر آزما کاوش سے نجات دلا دی۔ میکاے کے نظام تعلیم کو اسلامیانے کا یہ کارنامہ آج بھی اسکول کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی اسلامی علوم کے تقدس کا مضحکہ اڑا رہا ہے۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو بڑھ بڑھ کر علماء کو مدارس کی اصلاح کی نصیحت کرتے ہیں وہ اسکول کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب، تفسیر حدیث اور فقہ کو نصاب تعلیم کی روح اور اس کے محور کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا مقصد اور واقعی نتیجہ یہ ہے کہ عربی اسلامی علوم کی علمی قدر اور ان میں اختصاص کی اہمیت اور ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ یونیورسٹیوں میں جب اسلامی علوم سے متعلق کوئی تجویز زیر غور ہوتی ہے تو سائنسدانوں اور ایسے ہی بے ہرہ حضرات اس شد و مد سے بولتے ہیں گویا اسلامی علوم ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ عزت مند بیٹھے سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سائنس سے متعلق کسی کمیٹی کی مہر پر ایک اسلامی علوم کے ماہر کو نصیب ہو سائنس تجربی علم ہے جو مخصوص مزاج اور اخلاق کی تربیت کرتا ہے۔ ان میں سرفہرست علمی دیانتداری ہے۔ جب سائنسدان کسی ایسے موضوع میں دخل دے جس کا اسے ”علم“ نہ ہو تو اس کی سائنس میں شک

۱۔ ایسی ہی اسلامک ایڈوائسری کونسل پر ہمارے علماء رضا مند نظر آتے ہیں۔ دینی حلقوں میں جو تبصرے ہوئے ان میں صرف اتنا ہے کہ علماء کی تعداد بڑھا دی جائے، باقی اسلامی علوم کے جاہل بڑے بڑے دنیوی منافق کا غور لٹے بیٹھے رہیں تو مضائقہ نہیں۔ اسے بالخصوص کہئے یا سیاسی مجاہدت بہر حال ذاک اول الوہن۔

ہونے لگتا ہے۔ سائنس اتنی تنگ نظر تو نہیں کہ ایک سائنس دان اور ذہیل کا بیچ لاہور بند کرنے کی ہم چلائے، دوسرا سائنسدان تمام آرٹس کے شعبوں میں تالہ ڈالنے کی سوچے، اور جب سائنس کی تعلیم پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد نتیجہ بالواس کن ہونے تو یہ کہا جائے کہ آرٹس کی تعلیم اور ادبی اور انسانی علوم ”بے شہد“ ہیں۔ جب تک ان کا وجود باقی ہے سائنس صنعت و حرفت ترقی نہیں کر سکتی، ہر شخص کو سائنس پڑھائیے یہ تو چنگیزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسلامی علوم کو ایسے دوست عین تو دشمن ان کا اُسمان کیوں ہو، ایوب کے معتمد علیہ ہا پر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی، بہ شہادت جماعت اسلامی، اسلام کے بڑے دوست اور محافظ تھے لیکن عربی اسلامی علوم سے وہ بھی بہت ڈرتے تھے، انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسلامی علوم کو عربی زبان و ادب کی قید سے رہائی دلائیں گے۔ چنانچہ جب وہ عربی سے معری اسلامیات ایجاد کر چکے تو بولے کہ اگر عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں کے اسلامی ادب کو ایک پلڑے میں رکھا جائے۔ اور اردو کے اسلامی ادب کو دوسرے پلڑے میں تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ یہ کسی صوفی کے شطحات نہیں ہیں۔ یہ وہی اکبر کا دستور (عربی خواندن و دانستن آں عیب) ہے جسے مغرب کی عطا کردہ ذیہ کی نے بیسویں صدی کی زبان میں ادا کیا ہے۔ پہلے روشن خیالوں کی محفل میں عربی اسلامی علوم کا داخلہ ممنوع تھا، اب محفل کے اندر بلا کر ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ اور اردو کو اشارہ ہوتا ہے کہ وہ عربی کو منہ پڑائے۔

جہاں تک عربی مدارس کی اصلاح کا تعلق ہے، نصاب تعلیم کوئی جامد چیز نہیں کہ علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ اس میں تبدیلی نہ ہو۔ آپ دیکھیں عرصہ سے عربی زبان و ادب کی تعلیم خود عربی مدارس میں بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ مجموعی نصاب میں عربی زبان کی غرض دفایت صرف اتنی ہے کہ عربی کے متون سمجھنے پر قدرت ہو جائے۔ عربی ادب کا کوئی اہتمام نہیں۔ عربی میں تقریر و تحریر کا رواج ہی نہیں رہا۔ اللہ اشاد اللہ۔ علماء نے بھی عربی چھوڑا اردو کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہاں تک میرا تجربہ ہے کہ بعض علماء عربی زبان کی فضیلت کے بارے میں امام شافعیؒ اور ابن تیمیہؒ کی صراحت کی بجائے بیسویں صدی کے قوم پرستوں کی طرح گول بول بات کرنے لگے تھے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ استعمار نے ہمارے اور عرب ممالک کے مابین کوئی تعلیمی ثقافتی رابطہ باقی نہ چھوڑا۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہماری حکومتوں کی سر و ہری کے باوجود عرب ممالک سے کچھ نہ کچھ روابط پیدا ہوئے، جس کے نتیجے میں اب مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کی کوشش جاری ہے۔ کراچی کے ایک د مدرسے اس لحاظ سے ممتاز ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کے بعد دوسرا قدم ادبی ذوق کی تربیت ہوگا۔ تفسیر حدیث فقہ کا جو مقام ہمیشہ سے ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ البتہ اگر فقہ کے قلم سے تفسیر حدیث کی حق تلفی ہوتی ہو تو اس کی تلافی ضروری ہے۔

اب رہ جاتی ہے بات منطق فلسفہ و کلام کی۔ منطق کو فرسودہ نہیں کہا جاسکتا۔ وہی یونانی منطق جو مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ آج بھی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ منطق میں اگر کوئی چیز جدید ہے تو طریقہ تعلیم یا تفریحات و تفصیلات۔ اگر اصل یونان سے دور آ، پرسکتی ہے۔ تو اس میں اعجاز اور تعدیل قبول کرنے میں کیا تردد ہے۔؟ ہنسیا آگے آئے گا۔ واقعیت شرط ہے۔ فلسفہ بھی یونان سے آیا اور اس کے رد کے لئے علم کلام کی ضرورت پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ صدیوں کی بحث و تحقیق کے بعد بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ جو مسائل اس وقت جاذب توجہ تھے اور مسلمانوں میں انتشار فاعی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ اہل جن کا رد کلام میں پایا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت آج محض تاریخی رہ گئی ہے۔ اگر مختصر تاریخ کے طور پر پڑھایا جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ تصنیع اوقات ہے اس لئے کہ دور حاضر کے مسائل سے اس کا ذرا بھی ربط نہیں۔ مثلاً آج کے مسائل علمائیت (لادینیت) انکار ختم نبوت، انکار حدیث، قوم پرستی ہیں۔ اگر ان کی بابت نیا علم کلام ترتیب دیا جائے، اور یہ ذرا سی توجہ اور کوشش سے ممکن ہے، تو کہیں زیادہ مفید اور دلچسپ ہوگا۔ پھر ہر ایک کے لئے فلسفہ و کلام کے درس کا لزوم بھی محل نظر ہے۔ یہ یاد رہے کہ حضرت گنگوہیؒ کی رائے نہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند میں فلسفہ اور منطق کا درس ہو۔ ایک مرتبہ تھیل ارشاد کے لئے یہ دونوں فن خارج کر دئے گئے لیکن پھر ارکان شوریٰ نے کچھ عرصہ بعد ان دونوں فنوں کو دخل منساب کر دیا۔ مولانا جمیل الدین صاحب سابق رکن دارالعلوم سے منقول ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے خواب دیکھا کہ دارالعلوم کی اس عمارت میں جس کو نذرہ کہتے ہیں، ایک اجتماع ہو رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ و ثقیل فرزند ہیں۔ آپ کی نظر ایک کتے پر پڑی جو نذرہ کے سامنے صحن میں بیٹھا ہوا ہے۔ حکم ہوا اس کتے کو نکال دیا جائے۔ حضرت گنگوہیؒ نے منطق اور فلسفہ کو کتے کی تعبیر تصور کیا۔ (سید محمد میاں: علماء حق جلد اول ص ۸۵) بہر حال یہ تو کوئی بھی نہیں کہے گا کہ منطق و فلسفہ کا درس دین کے لوازم میں ہے یا اس کا اخراج دینی نقطہ نظر سے محل اعتراض ہے۔ زمانے کی ضرورت اور مصلحت کی بات ہے۔ ندوہ کے بانیوں نے بھی اس مسئلہ پر اسی حیثیت سے سوچا تھا۔

ہیئت کے متعلق پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ فالصۃ تجربی علم ہے، جو کچھ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے وہ محض عقل کی پیداوار ہے۔ (جو اس کا رشتہ وحی سے جوڑے وہ اسلام کا نادان دوست ہے) عقل کی ترقی جو نظام کائنات سے متعلق تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہو، بالکل فطری اور واجب التعلیم ہے۔ گذشتہ صدیوں میں عقل نے جو ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ ان سے سابقہ نظریات کا بطلان ثابت

ہرچکا ہے۔ اب مدارس میں ان باطل یونانی نظریات کو پڑھانا عقل کے لئے گمراہی کا باعث ہے۔ یہی حال طب کا ہے۔ طب یونانی کو مسلمانوں نے اپنے تجربات و مشاہدات سے فروغ دیا۔ اب جو اسے حریفہ آنر سمجھے گا، نئے اکتشافات سے بے خبر رہے گا۔ اور جھجکے گا۔ وہ پیچھے رہ جائے گا۔ اور دوسرے آگے بڑھ جائیں گے۔

علوم دنیا تمام عقل کی کاوش کا نتیجہ ہیں، وحی سے ان کا تعلق نہیں، جو علوم و نیلہ اس وقت مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ ان میں کمی اور رد و بدل عقل کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہئے۔ ہر دم متغیر ہیں خود کے نظریات۔ عقل کا اپنے سابقہ نظریات کو باطل قرار دینا کوئی عجیب بات نہیں اس سے کوئی دینی یا اخلاقی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس علوم نقلیہ، جن کی بنیاد وحی پر ہے، ان میں بحث و تھیس سے ترقی ہوتی ہے، تغیر و تبدل کا امکان ہی نہیں۔ اسی لئے عربی زبان و ادب، تفسیر حدیث فقہ کو ان کی جگہ سے ہٹانا یا کسی سال میں بھی کسی بھی نظام تعلیم میں ان کو جگہ نہ دینا دین سے بے وفائی ہے۔ بعض علوم و نیلہ ایسے ہیں جو اس وقت نصاب میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ان کیلئے نصاب میں جگہ رکال ضروری ہو گیا ہے۔ ان میں ہر نہرست انگریزی زبان ہے۔ اگر مدارس میں انگریزی کی تعلیم کا خاں نواہ انتظام ہو تو قدیم اور جدید کے درمیان نیلج آسانی سے پائی جاسکتی ہے۔ جدید سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ اگر جدید فلسفہ کا علم ہو تو اس سے قدیم کی تہیج ہوتی ہے۔ اس سے جدید میں رد و قدر کا دروازہ کھلتا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک متوازن فکر جنم لیتی ہے۔ اگر انگریزی زبان پر عبور ہو تو جدید فلسفہ عمرانیات اور معاشیات کا مستند علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سے دین و دنیا کا فرق مٹ جائے گا اور دین و دنیا دونوں کی بھلائی حاصل ہوگی۔ اگر مدارس میں سر دست ان مضامین کی تعلیم کا انتظام نہ ہو تو یہ ممکن ہے کہ مدارس کے طلبہ ان مضامین کی تعلیم یونیورسٹیوں میں حاصل کریں۔ اس طرح علی گڑھ اور دیوبند میں لین دین کا وہ خواب جو گذشتہ صدی میں شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، پورا ہو جائے گا، لیکن شرط یہی ہے کہ انگریزی زبان سے واقفیت ہو۔

کچھ اور مضامین بھی ہیں، مثلاً تاریخ جغرافیہ اور حساب بقدر ضرورت۔ ان مضامین کی ضرورت جتنا عبث ہے۔ صرف اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کروں گا۔ جس زمانہ میں میرا تعلق سیلون یونیورسٹی سے تھا میں نے ایک مدرسہ کے پڑھے ہوئے طالب علم کے داخلہ کی سفارش کی۔ طالب علم میری سفارش سے کرڈین کے پاس گیا۔ انہیں نہ تو عربی سے سروکار تھا نہ دخل دینے کا شوق۔ طالب علم سے دو باتیں کرنے کی خاطر انہوں نے کہ مدینہ دجلہ فرات کے جغرافیہ سے متعلق ایک دو سوال کئے۔ جوابات اتنے یاروں کن تھے کہ میرے

لکھے ہوئے کا احترام کرنے کے باوجود انہوں نے اس کا مجھ سے تذکرہ کیا اور مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔ اور حقیقت حال سمجھانے میں بڑی دقت ہوئی۔ بہت پہلے مفتی عبدالغنی نے جامع اذہر کی اصلاح کے سلسلہ میں انہیں باتوں پر زور دیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے بعد سے انیسویں صدی کے وسط تک علماء نے سیاست میں جو بھرپور کردار ادا کیا اُس کی غایت مغربی جمہوریت نہ تھی، بلکہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا کھویا ہوا سیاسی وقار بحال کرنا اور برتری قائم کرنا تھا۔ آج جو علماء سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ مغربی جمہوریت اور پارلیمنٹری نظام کے علمبردار ہیں۔ (چند اسلامی شفقوں کے ساتھ) جب سے پاکستان میں دستور سازی کا کام شروع ہوا ہے۔ علماء کی تقریریں پارلیمانی نظام کی روایات کے حوالوں سے اسی طرح بھری ہوتی ہیں جس طرح انگریزوں کی تعلیم یافتہ لیڈروں کی تقریریں۔ مغربی جمہوریت کی انگریزی اصطلاحیں بھی علماء کی زبان زد ہو گئی ہیں۔ تو کیا یہ مناسب نہیں کہ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ مغربی سیاست و جمہوریت کے علم سے لیس ہو کر سیاست کے میدان میں اتریں۔؟

جو اس بات کے لئے تیار نہیں کہ عربی زبان و ادب تفسیر حدیث فقہ کو نصاب تعلیم میں مرکزی جگہ دیں انہیں حق نہیں پہنچتا کہ علماء کو نصیحت کریں۔ لیکن اگر علماء از خود مدارس کی اصلاح کی سرچیں، جیسا کہ سوچ رہے ہیں۔ تو مذکورہ بالا امور قابلِ توجہ ہیں۔

دیانتداری اور خدمت ہمارا شعار ہے۔۔۔!

ہم اپنے ہزاروں کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں
جنہوں نے

پستول مارکہ آٹا

استعمال کر کے ہماری حوصلہ افزائی کی

نوشہرہ فلور ملز۔ جی ٹی روڈ۔ نوشہرہ